تہذیب وتمدنِ آشور

از جناب لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب آئی ایم ایس

گذشتہ سال برہان میں ہمارا ایک مقالہ بعنوان "تاریخ کے دورِ آغاز میں آرین قومیں" شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں ہم نے کچھ اقوام کا ذکر کیا تھا۔ اس دفعہ انھیں اقوام میں سے ایک کا جو آشوری قوم" (Assyrians) کے نام سے منسوب ہے، ذکر تفصیل سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قوم اپنی تہذیب اور تاریخ کے لحاظ سے بہت مشہور ہے اور اس کے متعلق بہت سے اہم تاریخی پہلو سامنے آئے ہیں جن کا تعلق قصص القرآن سے بھی بڑی حد تک ہے۔

آشور کی مملکت کی تاریخ تقریباً ۳۰۰۰ (تین ہزار) قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ یہ علاقہ ہلالِ خصیب کے شمال میں دریائے ذاب خورد (Lesser zab) کے دہانے تک محدود تھا اس مملکت کا جنوبی حصہ ذاب بزرگ (Greater zab.) اور ذابِ خورد کے دہانوں سے لیکر دریائے دجلہ تک پہنچ جاتا تھا۔ زیادہ تر اس علاقے کا شمالی حصہ پہاڑی ہے اور کچھ سطح مرتفع ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں اکثر وادیاں بھی موجود ہیں جو نہایت زرخیز ہیں، اور کاشتکاری کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ دریاؤں کے کنارے تو خاص طور پر نہایت زرخیز ہیں۔ اس علاقے کی اہمیت اس سے بھی دوبالا ہو جاتی ہے کہ تمام مشہور شاہراہیں جو ایران، کردستان اور عراق کو ملاتی ہیں یہاں ہی سے ہو کر گذرتی ہیں۔ ترکستان اور لبنان سے بھی ان شاہراہوں کا تعلق ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں ایک وسیع میدان ہے جو ایک طرف تو کرکوک تک پہنچتا ہے اور دوسری جانب موصل تک چلا گیا ہے۔ اسی میدان کے وسط میں اربیل واقع ہے۔ اربیل سے موصل کی طرف جو میدان ہے یہ وہی مشہور میدان ہے جہاں سکندر اعظم اور دارا کے مابین جنگ ہوئی اور اسی جنگ کو جنگِ اربیلا

کہا جاتا ہے (نقشے کے لئے ہمارا مقالہ ملکِ طاؤس جو گذشتہ سال برہان میں شائع ہوا تھا، ملاحظہ ہو)۔

ان دریاؤں میں ماہِ اپریل سے طغیانیاں آنا شروع ہوتی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں تمام شمالی سلسلۂ کوہستان برف پوش ہوجاتا ہے اور اپریل سے یہ برف پگھلنا شروع ہوجاتا ہے۔ ان طغیانیوں کی وجہ سے یہ علاقہ اور بھی زرخیز ہے۔ یہ دریا کردستان کے پہاڑوں سے نکل کر آتے ہیں یہ وہی کوہستانی علاقہ ہے جہاں سے گذر کر اول اول آرین گروہ ہلال خصیب میں پھیل گئے ہیں۔ اور کچھ گروہ آشور میں آباد ہوگئے تھے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب ممالک پر کوئی قوم دھاوا بولتی ہے تو وہ اکثر پہاڑی علاقوں میں سے اترتی ہے، پہاڑی علاقوں کے باشندے اکثر جفاکش اور بہادر ہوتے ہیں۔

اول اول جب آرین اقوام کا یہاں ورود ہوا تو ہمیں یہاں کی آبادی کچھ ملی جلی نظر پڑتی ہے (Paloelithic Age) کے آثار بھی اس علاقہ میں ملتے ہیں۔ ڈیرہ زور کے علاقے Dair-az-Zor. میں تو بہت سے قدیم ہتھیار بھی دستیاب ہوچکے ہیں۔ نہ صرف یہاں، بلکہ نینوا (Ninerah) اور آشور (Ashur) جسے آج کل قلعہ شرکت کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی متعدد پرانی آبادیوں کے آثار ملے ہیں۔

اس علاقے سے حاصل شدہ اشیاء کی مشابہت اُر (Ur) سے برآمد شدہ چیزوں سے بھی بہت ہے اور چونکہ اُر (Ur) سے جو ہتھیار اور برتن ملے ہیں ان کے وقت کا تعین ۲۹۰۰ قبل مسیح کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ آشور کی تہذیب اس زمانے سے ملتی جلتی ہے جبکہ انسان نے اول دفعہ مٹی کے مصور برتن (Painted Pottery.) ایجاد کئے تھے ماہرین آثار قدیمہ اس زمانے کی تاریخ ۳۵۰۰ قبل مسیح قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد انسان نے دھاتوں کا استعمال ایجاد کیا تو مٹی کے برتنوں کی صنعت (Pottery.) معدوم ہونا شروع ہوگئی۔ اسی لئے ۳۰۰۰ قبل مسیح سے پیشتر ہمیں آشور میں کوئی تہذیب کے نشانات نہیں ملتے۔ زیادہ تر جو ثبوت بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے وقت ۲۷۰۰-۳۰۰۰ قبل مسیح تک کا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وقفہ محض اس لئے پیدا ہوگیا ہے کہ ماہرین ان علاقوں میں مکمل طور پر کھدائی نہیں کر سکے۔ ابھی بہت سے قدیم مقامات یہاں دبے

پڑے ہیں۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ جب سنحرب (Sennacherib.) نے دوبارہ نینوا کو تعمیر کیا تو اس نے اس کی بنیاد پر ایک بہت وسیع چبوترا بنوایا۔ ممکن ہے پرانی تہذیب اس کے نیچے ابھی پوشیدہ ہو کیونکہ اس چبوترے کو ابھی مکمل طور پر صاف نہیں کیا گیا۔ دوسرے اس علاقے میں ابھی بہت سے ٹیلے (Mounds.) موجود ہیں جہاں کھدائی شروع نہیں ہوئی۔ جنگِ عظیم سے پیشتر اور اس کے دوران میں ترکی حکومت نے یہاں کھدائی ممنوع قرار دیدی تھی۔ اور اس کے بعد تھوڑا بہت جو کام ہوا ہے وہ ابھی تک نامکمل ہے۔

اسی صدی میں جن ماہرین نے یہاں کام کیا ہے ان میں سے سب سے مشہور بوتا (Bota) ایک فرانسیسی آرکیولوجسٹ (Archeologist.) تھا۔ سڈنی سمتھ (Sydney Smith) مسٹر کنگ (L.W. King.) اور مسٹر راسم (Rassam.) تھے۔ گذشتہ صدی کے ماہرین جنھوں نے اس تحقیق کی بنیاد رکھی ان میں سب سے مشہور لے یارڈ (Layard) رالنسن (Rawlinson) اور ڈاکٹر ہنکس (Hincks.) تھے۔ یہ تمام ماہرین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا اس علاقے میں باقی رہ گیا ہے۔

ان ماہرین آثریات (Assyriologists.) کی راہ میں جو دقتیں پیش آئیں اس کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ شروع شروع میں جب بوتا (Bota.) نے کھدائی شروع کی تو اس کو اجازت لینے میں بہت دقت پیش آئی، ترکی حکومت کسی شرط پر بھی رضامند نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ ٹیلہ تھا جس پر آج کل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے یہ ٹیلہ موصل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور قدیم نینوا (Ninevah.) کا ہی ایک حصہ ہے۔ اب تو اس ٹیلہ پر ایک قصبہ بھی قائم ہو چکا ہے بوتا (Bota) نے ایک اچھوتی چال چلی مگر کارگر نہ ہوئی۔ اس نے اس ٹیلے پر چند ایک مکانات خرید کئے اور ان کے اندر سے اس نے کھدائی کا عمل خفیہ طور پر شروع کر دیا۔ وہ اپنے اس فعل میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ کھدائی کے دوران میں اس کو دو سرنگیں ملیں جو محلات کی طرف پہنچتی تھیں یہ محلات سنحرب (Sennacherib.) کے تعمیر شدہ تھے۔ اسے ان سرنگوں میں

چند ایک بہت اہم کتبے اور بت بھی ملے۔ مگر کسی نے یہ راز فاش کر دیا۔

جب ترکی حکومت کے پاس اس کی شکایت پہنچی تو بوتا کو وہاں سے نکل جانے کا حکم ملا، ہماری دانست میں یہ جو رکاوٹ اسے پیش آئی اس کی وجہ محض مذہبی تعصب تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ شخص خفیہ طور پر حضرت یونس علیہ السلام کے مزار تک پہنچنا چاہتا ہے اور شاید وہاں اسے کسی خزانے کے ملنے کا امکان نظر آتا ہے۔ اس روز سے آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ دوبارہ اس کام کو شروع کر سکے۔ ہمارا خیال ہے یہ ٹیلہ جس پر آجکل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار ہے سنحرب (Sennacherib) کے زمانے میں اس کے محل کا ایک حصہ تھا۔

آشور (Ashur) یعنی قلعہ شرکت جو مملکت آشور کا دارالخلافہ تھا یہاں بھی ایک کثیر رقم کھدائی میں صرف کی گئی مگر حسب توقع اس قدر دستیاب نہ ہو سکا کہ آشور کی قدیم تاریخ پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ یہ دارالخلافہ اول اول ۲۷۵۰ - ۲۶۵۰ قبل مسیح کے درمیان بنا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ عراق کا محکمہ آثار قدیمہ عنقریب اس مقام پر از سرِ نو کام شروع کر دیگا۔ بہت ممکن ہے کہ پھر اس علاقے کی قدیم داستان مکمل ہو جائے۔

اس علاقے کے متعلق جس قدر بھی روایات مشہور ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر روایتوں کی تصدیق نہیں ہوئی، تاہم یہ سب نہایت دلچسپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی تہذیب طوفانِ نوحؑ سے بھی قدیم تر ہے۔ چند ایک بادشاہوں کے نام خطِ میخی سے بھی حل ہو چکے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بھی پہلے کے تھے۔ ایک مورخ نے تو دس بادشاہوں کے نام لئے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے پیشتر مملکتِ آشور پر حکمراں تھے۔ یہ مورخ ایک کلدانی ہے اور سنحرب (Sennacherib) کے زمانے میں تھا۔ ممکن ہے یہ کلدانی انہی لوگوں میں سے ہو جن کو پکڑ کر سنحرب بابل سے لایا تھا۔ اس علاقے میں آجکل بھی کلدانیوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ اس کلدانی مورخ نے محض وہ قصے دوہرائے ہیں جو خود اس کے زمانے سے دو ہزار سال پیشتر کے واقعات تھے۔ ان قصوں کا ذکر سڈنی سمتھ (Sydney Smith) اپنی مشہور و معروف کتاب ہسٹری آف اسیریا (History of Assyria.) میں کرتا ہے۔

بہر کیف ماہرین آثارِ قدیمہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ آشور کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے جس کا وقت ...۳ قبل مسیح سے بھی بہت پہلے پہنچتا ہے یہانتک کہ اُر (Ur) کی تہذیب سے بھی بہت پہلے کی ہے۔

طوفانِ نوح کا قصہ سومیری کتبات سے بھی ثابت ہوتا ہے اس واقعہ کو وہاں گلگمیش (Gilgamesh) کی روایت سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہی سب سے پرانی روایت طوفان نوح کے متعلق معلوم ہوئی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اسوقت سے بہت سے مقاموں کو اس واقعہ کے ساتھ منسوب کردیا گیا ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان علاقوں کا جو طوفانِ نوح کے واقعہ کے ساتھ وابستہ ہیں، تھوڑا بہت ذکر کردیا جائے۔

ملک طاؤس والے مقالے میں ہم نے تین مقاموں کا ذکر کیا تھا، کوہ سفینہ، عین سفنی اور جبلِ سنجار۔ ان علاقوں کے ساتھ مندرجہ ذیل قصے منسوب ہیں:۔

کوہ سفینہ، اربیل کے شمال کی طرف تقریباً ۱۷ میل مقام شقلاوہ کے قریب واقع ہے اس کو کوہِ سفینہ (یعنی کشتی والا پہاڑ) اس لئے کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پانی پر تیرتی ہوئی نکلی تو اس پہاڑ کے پاس آکر رک گئی اور یہیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کشتی پر سے اتارا۔

دوسرا مقام عین سفنی ہے اور یہ موصل سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ۲۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں سے راستہ شیخ عدی اور بادیان (Bavian) کو جاتا ہے۔ یہاں ایک چشمہ اب بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ یہ روایت وابستہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب طوفان کی خبر دی گئی اور کشتی بنانے کا حکم ملا تو انھوں نے اسی مقام پر کشتی بنائی۔ اور یہ جو چشمہ موجود ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے طوفان آگیا۔

تیسرا مقام جبل سنجار ہے یہ مقام موصل کے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس پہاڑ میں اب بھی غار موجود ہیں اور ان میں یزیدی رہتے ہیں۔ ان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب عین سفنی میں طوفان آیا تو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہاں آکر اس پہاڑ کے پاس رک گئی

یہ تینوں قصے ہمارے سننے میں وہاں آئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں طوفانِ نوح سے متعلق ہندوستان میں ایک بحث شروع ہوئی تھی۔ اس بحث میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے، میاں محمد مظہر الحق بیرسٹرایٹ لا، مرحوم مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی۔ لالہ بنائک پرشاد چریاکوٹی تلمیذ حضرت مولانا مولوی قاضی عنایت رسول صاحب۔ یہ تمام بحث ایک رسالہ کی شکل میں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس رسالہ کا نام "احسن البیان فی تحقیق مسئلۃ الطوفان" ہے۔ اس تمام بحث میں خطِ منحنی کے کتبات سے بحث کی گئی ہے اور موضوع یہ ہے کہ طوفان عام تھا یا کہ کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ تھا۔ سب سے دلچسپ بحث وہ ہے جو پنڈت صاحب نے شروع کی تھی، پنڈوں اور دیگر ہندو کتابوں سے وہ یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہر جگ کے بعد ایک طوفانِ عظیم آتا رہا ہے۔

یہ بات ہمیں اس سے پیشتر بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر ہم نے اس کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ ایک مقام جو بندھیل کھنڈ میں ہے اس کے متعلق بھی ہندوؤں میں اس طوفان کا قصہ پایا جاتا ہے یہ مقام ریاست بیجاور کے قریب بندھیل کھنڈ میں واقع ہے اور اس کو بھیم کھنڈ کہتے ہیں۔ ہم نے اس مقام کو ۱۹۴۵ء میں دیکھا۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ایک کنواں ہے مگر قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کے اندر اچھی خاصی سیڑھیاں ہیں جو تقریباً دس فٹ چوڑی ہیں اور ان کی تعداد تقریباً تیس اور چالیس کے درمیان ہے نیچے اتر کر ایک وسیع دالان میں آتے ہیں جس کے ایک طرف غار ہیں اور دوسری جانب پہاڑ کو تراش کر کمرے بنا دیئے گئے ہیں۔ پھر ایک سیڑھیوں کا اور سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام پر ایک تالاب ہے مختصر سا۔ یہ تالاب درحقیقت چشمہ ہے۔ روایت ہے کہ اس تالاب کی گہرائی معلوم نہیں ہو سکی اور یہ واقعہ ہے کہ جب ہم نے اس کے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو اس کی سطح نظر نہیں پڑتی تھی۔ پانی اس قدر نیلے رنگ کا تھا کہ سمندر کا پانی بھی اس قدر نیلا دیکھنے میں نہیں آیا، مگر نہایت شفاف تھا۔ تالاب کے دونوں جانب دو پتھر جو اس چٹان کے حصے تھے دور تک نیچے جاتے دکھائی دیتے تھے مگر تلے نظر نہ آتے تھے۔ اس تالاب کے عین اوپر پہاڑ سے چھت بنی ہوئی تھی جس میں ایک کافی بڑا سوراخ تھا اور اس سوراخ سے روشنی اندر آکر تمام

جگہ کو روشن کر رہی تھی۔ اس مقام کے ساتھ ہندوؤں نے یہ قصہ منسوب کر رکھا ہے کہ جو پہلا طوفان آیا وہ یہاں سے شروع ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس مقام کو بھیم کھنڈ کیوں کہا جاتا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ قیاس یہ کہتا ہے بھیم جو بادشاہ تھا اس کے ساتھ کوئی مناسبت ہوگی۔ کھنڈ سنسکرت میں تالاب کو کہتے ہیں اسی لئے بندھیل کھنڈ کے علاقے کا نام یہ پڑ گیا ہے کیونکہ اس علاقے میں جگہ جگہ تالاب اور جھیلیں ہیں۔

درحقیقت مستشرقین نے علاقہ طوفانِ نوح کے متعلق جو علاقہ تجویز کیا ہے وہ ارارات (Ararat) کا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات آشوریوں کی ہو رہی تھی۔

لفظ آشور کے متعلق ہم پچھلے کسی مقالہ میں لکھ آئے ہیں کہ یہ آشوریوں کا دیوتا تھا اسی کے نام پر مقام آشور (قلعہ شرکت) کا نام رکھا گیا اور اسی نام سے آشوری قوم کو (Assyrians.) یاد کیا جاتا ہے اس لفظ کا استعمال ہمیں خطِ میخی کے کتبوں میں دو طرح سے ملتا ہے ایک آشیر (Ashir.) اور دوسرے آشور (Ashur) ابتدا میں اس لفظ کو تین معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اول شہر یا بستی کے لئے۔ دوئم ملک یا زمین کے لئے اور سوئم دیوتا کے معنوں میں۔ ہمیں آشیر (Ashir) کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابتدا میں لفظ رحمٰن اور رحیم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ سومیری (Sumerian.) زبان میں اسی لفظ کو آ۔ اُسار (A-Usar.) کہا جاتا تھا اب یہ معلوم نہیں کہ یہ لفظ سامی Sematic زبان کا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ عبرانی (Hebrew.) زبان کے لفظ آشر کا مترادف ہو۔ آشوری زبان میں اس لفظ کو دو طرح لکھا جاتا تھا خطِ میخی میں یہ لفظ ملاحظہ ہو۔

۱-
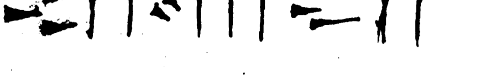

۲-
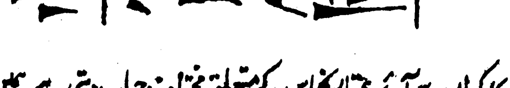

یہ آشوری کہاں سے آئے؟ تاریخ اس کے متعلق مختلف جواب دیتی ہے۔ ہمیں ان سب سے

اختلاف ہے۔ گذشتہ سال کے مقالوں میں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ بھی آرین اقوام کا ایک گروہ تھا جو سومیری اقوام کے بعد اس علاقے میں پہنچا۔ اگرچہ سومیری خود اس علاقے میں سے ہو کر ہلال خصیب کے جنوب میں پہنچے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقہ کی تہذیب اُر (Ur) کی تہذیب سے قدیم تر ہو۔ اور یہ جو آثار ثابت کرتے ہیں کہ یہاں کی تہذیب قدیم تر ہے تو غالباً اس اولین گروہ کے نشانات ہیں جو یہاں سے ہو کر گذریں اور سومیری کہلائیں۔ غالباً یہ گروہ آرمینیا (Armenia.) سے ہوتا ہوا کردستان پہنچا اور کردستان کو عبور کر کے ترکستان جس کو اس زمانے میں اناطولیا کہا جاتا تھا وہاں پہنچا اور پھر وہاں سے مملکتِ آشور آباد کی

مورخین یہ کہتے ہیں کہ آشوری حکومتِ بابل کے فرمانروا تھے اور اکادی تھے۔ ہمارے نزدیک یہ تشخیص غلط ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک زمانے میں آشور پر بابلیوں کی حکومت ہو گئی تھی جسے حمیرابو (Hammirab) نے اس کو فتح کر لیا تھا اس بات کو ثابت کرنے کے لئے انجیل سے سند لیجاتی ہے

مورخین کہتے ہیں کہ باب پیدائش (۱۱:۱) میں مذکور ہے کہ آشور (نمرود) بابل سے باہر چلا گیا۔ اور نینوا کی بنیاد رکھی۔ ہماری دانست میں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آشور ہمیشہ ہی بابلیوں کے ماتحت رہا ہے، ان کی اپنی بھی حکومت تھی جو کئی صدیوں تک قائم رہی۔ بلکہ ہمیں تو بابلیوں کی تہذیب کا بھی آشوری تہذیب پر بہت کم اثر نظر آتا ہے۔ آکادی اور سومیری زبانوں کا بھی آشوری زبان سے دور کا تعلق نہیں۔ یہ دونوں زبانیں آشوری زبان سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ رسم الخط بہت ملتا ہے ممکن ہے یہ رسم الخط آشور ہی میں شروع ہوا ہو۔ جیسے کتبوں سے ثابت ہے کہ آشوریوں کی تہذیب سومیری تہذیب سے زیادہ پرانی تھی۔ دو ہزار سال قبل مسیح آشوری تہذیب یہاں تک ترقی کر چکی کہ ہمیں یہاں سیاسی اور ادبی ادارے ملتے ہیں۔ اور ان کے اپنے قانون ملک میں رائج تھے جن میں عورتوں کے حقوق کا باقاعدہ طور پر تحفظ کیا گیا تھا۔ ان کے وزراء اور امراء بھی سومیریوں سے زیادہ مہذب تھے جو اپنے محل اور لائبریریاں رکھتے تھے۔ یہ لائبریریاں اب متعدد جگہوں سے برآمد ہو چکی ہیں۔

مورخین کی ایک شاخ نے جب یہ محسوس کیا کہ آشوریوں کا تعلق اکادیوں اور سومریوں کے ساتھ ثابت نہیں ہو سکتا تو انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ ان کو سیمٹک (Semetic.)

ثابت کیا جائے۔ اور بتایا جائے کہ یہ دراصل وسط عرب کے باشندے تھے۔ اس کی بنا یہ تھی کہ ان دونوں کی زبانوں میں مشابہت تھی۔

مگر دیگر امور اس تحقیق کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں۔ ممکن ہو سکتا ہے عربی نسل کو آشور کے ساتھ راہ و رسم ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک تہذیب کا دوسرے پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہ بھی بعید نہیں کہ ان کی زبان سے آشوریوں نے بہت سے الفاظ اخذ کر لئے ہوں۔ لیکن ان دونوں کے کلچر میں بے حد تفاوت ہے مذاہب میں بہت اختلاف نمایاں ہے۔ شکل و شباہت میں آشوری، سوریا کے آرامیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں (Armaens of Syria.) یہ مضبوط اور پست قد تھے اور ان کے بال گھونگر والے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ عربوں کا قد و قامت اس کے بالکل برعکس ہے۔

مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ آشوری ایشیائے کوچک (Asia Minor.) اور دریا سے

لہ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیق میں بہت کچھ حقیقت ہے۔ آشوری زبان پر واقعی قدیم عربی زبان کا اثر پڑا۔ اور اکثر الفاظ اب بھی عربی زبان کے خطِ میخی کے کتبوں سے حل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم لفظ اربیل (Arbil.) ہی کو لیتے ہیں۔ اس مقام کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک بہت قدیم شہر ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ بتاتے ہیں کہ یہ شہر دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اور فقط یہی ایک شہر ہے جو کبھی تباہ و برباد نہیں ہوا۔ دمشق اور بیروت وغیرہ جو اس وقت موجود ہیں اسی زمانے کے شہر ہیں مگر کئی بار تباہ ہو چکے ہیں۔ مگر اربیل کبھی تباہ نہیں ہوا اور متواتر آباد چلا آیا ہے۔ اس شہر کا نام ہمیں اول اول اُر (Ur) کے تیسرے شاہی خاندان کے کتبوں میں ملتا ہے وہاں اس کو اُربلم (Urbillum.) لکھا ہے اس کے بعد آشوریوں نے اس لفظ میں معانی تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ اور بالآخر اپنی زبان کے مطابق اس کا نام اربعہ ایلو (Araba-ilu.) رکھ دیا۔ اس کا مطلب چار دیوتا ہے۔ اربعہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں اور ایلو آشوری زبان میں دیوتا کو کہتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ بعد میں ایلویاہ (Iloha.) اور اختصار ہو گیا۔ یہی لفظ اربعہ ایلو بدلتے بدلتے اربیل بن گیا اور یہی لفظ آج کل مستعمل ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے نقل الکلمہ کی جس کی تشریح ہم اسی عنوان کے مقالے میں، جو گذشتہ سال برہان میں شائع ہوا تھا، کر آئے ہیں۔

دجلہ کے مشرقی حصہ کے باشندے تھے۔ یہ علاقہ تقریباً وہی ہے جو ہم نے ابھی ان کے لئے مقرر کیا ہے ان کا دوسری قوموں میں اختلاط بہت جلد ہو گیا اور انھوں نے دوسری قوموں میں لاتعداد شادیاں بھی کیں۔ آشوریوں کی تہذیب اور کلچر کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ انھوں نے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور ایک مکمل کیلنڈر بھی ایجاد کیا تھا۔ ان کے مہینوں کے نام دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے اس لئے ذیل میں درج کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے تلفظ کے متعلق ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے۔ درحقیقت خطِ میخی کے کتبوں کے تو حل ہو گئے مگر اس زبان کا تلفظ کیا تھا اس کی تحقیق ابھی نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہونا ممکن ہے۔ جب تک ایک زبان کو بولا جائے نہ سنا جائے اس کا تلفظ متعین کرنا نامعقول ہے۔ بہرحال مہینوں[۱] کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ کرّاتے	Qarrate.
۲۔ تان ؟ مارتے	Tan (?) Marte.
۳۔ سین	Sin.
۴۔ کوزآلی	Kuzalli.
۵۔ آلاناتے	Allanate.
۶۔ بیلتی ایکلیم	Belti-Ekallim.
۷۔ ساراتے	Sarate
۸۔ کینتے	Kinate.
۹۔ موہرالی[۲]	Muhr illi
۱۰۔ آب سرآنی	Absarani
۱۱۔ ہبور	Hibur
۱۲۔ سپیم	Sippem

[۱] یہ نام ہم نے سڈنی سمتھ کی کتاب ہسٹری آف آشریا سے لئے ہیں۔
[۲] موہرالی غالباً مہرالی ہے جو حمیرابو (حمیرابی) کے کتبوں میں اللہ تعالیٰ کے لئے مستعمل ہے۔

پڑے ہیں۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ جب سنحرب (Sennacherib.) نے دوبارہ نینوا کو تعمیر کیا تو اس نے اس کی بنیاد پر ایک بہت وسیع چبوترا بنوایا۔ ممکن ہے پرانی تہذیب اس کے نیچے ابھی پوشیدہ ہو کیونکہ اس چبوترے کو ابھی مکمل طور پر صاف نہیں کیا گیا۔ دوسرے اس علاقے میں ابھی بہت سے ٹیلے (Mounds.) موجود ہیں جہاں کھدائی شروع نہیں ہوئی۔ جنگِ عظیم سے پیشتر اور اس کے دوران میں ترکی حکومت نے یہاں کھدائی ممنوع قرار دیدی تھی۔ اور اس کے بعد تھوڑا بہت جو کام ہوا ہے وہ ابھی تک نامکمل ہے۔

اسی صدی میں جن ماہرین نے یہاں کام کیا ہے ان میں سے سب سے مشہور بوتا (Bota) ایک فرانسیسی آرکیولوجسٹ (Archeologist.) تھا۔ سڈنی سمتھ (Sydney Smith) مسٹر کنگ (L.W. King.) اور مسٹر راسم (Rassam.) تھے۔ گذشتہ صدی کے ماہرین جنھوں نے اس تحقیق کی بنیاد رکھی ان میں سب سے مشہور لے یارڈ (Layard) راالنسن (Rawlinson) اور ڈاکٹر ہنکس (Hincks.) تھے۔ یہ تمام ماہرین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا اس علاقے میں باقی رہ گیا ہے۔

ان ماہرین آثریات (Assyriologists.) کی راہ میں جو دقتیں پیش آئیں اس کا اندازہ ذیل کی مثال سے ہوسکتا ہے۔ شروع شروع میں جب بوتا (Bota.) نے کھدائی شروع کی تو اس کو اجازت لینے میں بہت دقت پیش آئی ترکی حکومت کسی شرط پر بھی رضامند نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ ٹیلہ تھا جس پر آج کل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے یہ ٹیلہ موصل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور قدیم نینوا (Nineveh.) کا ہی ایک حصہ ہے۔ اب تو اس ٹیلہ پر ایک قصبہ بھی قائم ہوچکا ہے بوتا (Bota) نے ایک اچھوتی چال چلی مگر کارگر نہ ہوئی۔ اس نے اس ٹیلے پر چند ایک مکانات خرید کئے اور ان کے اندر سے اس نے کھدائی کا عمل خفیہ طور پر شروع کردیا۔ وہ اپنے اس فعل میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ کھدائی کے دوران میں اس کو دو سرنگیں ملیں جو محلات کی طرف پہنچتی تھیں یہ محلات سنحرب (Sennacherib.) کے تعمیر شدہ تھے۔ اسے ان سرنگوں میں

چند ایک بہت اہم کتبے اور بت بھی ملے۔ مگر کسی نے یہ راز فاش کر دیا۔

جب ترکی حکومت کے پاس اس کی شکایت پہنچی تو یونا کو وہاں سے نکل جانے کا حکم ملا، ہماری دانست میں یہ جو رکاوٹ اسے پیش آئی اس کی وجہ محض مذہبی تعصب تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ شخص خفیہ طور پر حضرت یونس علیہ السلام کے مزار تک پہنچنا چاہتا ہے اور شاید وہاں اسے کسی خزانے کے ملنے کا امکان نظر آتا ہے۔ اس روز سے آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ دوبارہ اس کام کو شروع کر سکے۔ ہمارا خیال ہے یہ ٹیلہ جس پر آجکل حضرت یونس علیہ السلام کا مزار ہے سنجرب (Sennacherib) کے زمانے میں اس کے محل کا ایک حصہ تھا۔

آشور (Ashur) یعنی قلعہ شرکت جو مملکت آشور کا دارالخلافہ تھا یہاں بھی ایک کثیر رقم کھدائی میں صرف کی گئی مگر حسب توقع اس قدر دستیاب نہ ہو سکا کہ آشور کی قدیم تاریخ پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ یہ دارالخلافہ اول اول ۲۶۵۰ — ۲۷۵۰ قبل مسیح کے درمیان بنا تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ عراق کا محکمہ آثار قدیمہ عنقریب اس مقام پر از سر نو کام شروع کر دیگا۔ بہت ممکن ہے کہ پھر اس علاقے کی قدیم داستان مکمل ہو جائے۔

اس علاقے کے متعلق جس قدر بھی روایات مشہور ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر روایتوں کی تصدیق نہیں ہوئی، تاہم یہ سب نہایت دلچسپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی تہذیب طوفانِ نوحؑ سے بھی قدیم تر ہے۔ چند ایک بادشاہوں کے نام خطِ میخی سے بھی حل ہو چکے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بھی پہلے کے تھے۔ ایک مورخ نے تو دس بادشاہوں کے نام لئے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے پیشتر مملکتِ آشور پر حکمراں تھے۔ یہ مورخ ایک کلدانی ہے اور سنجرب (Sennacherib) کے زمانے میں تھا۔ ممکن ہے یہ کلدانی انہی لوگوں میں سے ہو جن کو پکڑ کر سنجرب بابل سے لایا تھا۔ اس علاقے میں آجکل بھی کلدانیوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ اس کلدانی مورخ نے محض وہ قصے دوہرائے ہیں جو خود اس کے زمانے سے دو ہزار سال پیشتر کے واقعات تھے۔ ان قصوں کا ذکر سڈنی سمتھ (Sydney Smith) اپنی مشہور و معروف کتاب ہسٹری آف اثریا (History of Assyria.) میں کرتا ہے۔

بہر کیف ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آشور کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے جس کا وقت ... ۳۰ قبل مسیحؑ سے بھی بہت پہلے پہنچتا ہے یہاں تک کہ اُر (Ur) کی تہذیب سے بھی بہت پہلے کی ہے طوفانِ نوح کا قصہ سومیری کتبات سے بھی ثابت ہوتا ہے اس واقعہ کو وہاں گلگمیش (Gilgamesh) کی روایت سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہی سب سے پرانی روایت طوفانِ نوح کے متعلق معلوم ہوئی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس وقت سے بہت سے مقاموں کو اس واقعہ کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان علاقوں کا جو طوفانِ نوح کے واقعہ کے ساتھ وابستہ ہیں، تھوڑا بہت ذکر کر دیا جائے۔

ملک طاؤس والے مقالے میں ہم نے تین مقاموں کا ذکر کیا تھا، کوہ سفینہ، عین سفنی اور جبل سنجار، ان علاقوں کے ساتھ مندرجہ ذیل قصے منسوب ہیں:۔

کوہ سفینہ، اربیل کے شمار کی طرف تقریباً ۷۰ میل مقام شقلاوہ کے قریب واقع ہے اس کو کوہِ سفینہ (یعنی کشتی والا پہاڑ) اس لئے کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پانی پر تیرتی ہوئی نکلی تو اس پہاڑ کے پاس آکر رک گئی اور یہیں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو کشتی پر سے اتارا۔

دوسرا مقام عین سفنی ہے اور یہ موصل سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ۲۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں سے راستہ شیخ عدی اور بادیان (Bavian) کو جاتا ہے۔ یہاں ایک چشمہ اب بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ یہ روایت وابستہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو جب طوفان کی خبر دی گئی اور کشتی بنانے کا حکم ملا تو انھوں نے اسی مقام پر کشتی بنائی۔ اور یہ جو چشمہ موجود ہے اسی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے طوفان آگیا۔

تیسرا مقام جبل سنجار ہے یہ مقام موصل کے جنوب مغرب کی طرف تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ اس پہاڑ میں اب بھی غار موجود ہیں اور ان میں یزیدی رہتے ہیں۔ ان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب عین سفنی میں طوفان آیا تو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی یہاں آکر اس پہاڑ کے پاس رک گئی

یہ تینوں قصے ہمارے سننے میں وہاں آئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں طوفانِ نوح سے متعلق ہندوستان میں ایک بحث شروع ہوئی تھی۔ اس بحث میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے، میاں محمد مظہر الحق بیرسٹرایٹ لا مرحوم' مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی۔ لالہ بنائک پرشاد چریاکوٹی تلمیذ حضرت مولانا مولوی قاضی عنایت رسول صاحب۔ یہ تمام بحث ایک رسالہ کی شکل میں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس رسالہ کا نام "احسن البیان فی تحقیق مسئلۃ الطوفان" ہے۔ اس تمام بحث میں خطِ میخی کے کتبات سے بحث کی گئی ہے اور موضوع یہ ہے کہ طوفان عام تھا یا کسی خاص مقام کے ساتھ وابستہ تھا۔ سب سے دلچسپ بحث وہ ہے جو پنڈت صاحب نے شروع کی تھی۔ پانڈوں اور دیگر ہندو کتابوں سے وہ یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہر جگ کے بعد ایک طوفانِ عظیم آتا رہا ہے۔

یہ بات ہمیں اس سے پیشتر بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر ہم نے اس کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ ایک مقام جو بندھیل کھنڈ میں ہے اس کے متعلق بھی ہندوؤں میں اس طوفان کا قصہ پایا جاتا ہے یہ مقام ریاست بیجاور کے قریب بندھیل کھنڈ میں واقع ہے اور اس کو بھیم کھنڈ کہتے ہیں۔ ہم نے اس مقام کو ۱۹۴۵ء میں دیکھا۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ایک کنواں ہے مگر قریب پہنچکر معلوم ہوا کہ اس کے اندر اچھی خاصی سیڑھیاں ہیں جو تقریباً دس فٹ چوڑی ہیں اور ان کی تعداد تقریباً تیس اور چالیس کے درمیان ہے نیچے اتر کر ایک وسیع دالان میں آتے ہیں جس کے ایک طرف غار ہیں اور دوسری جانب پہاڑ کو تراش کر کمرے بنادیئے گئے ہیں۔ پھر ایک سیڑھیوں کا اور سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام پر ایک تالاب ہے مختصر سا یہ تالاب در حقیقت چشمہ ہے۔ روایت ہے کہ اس تالاب کی گہرائی معلوم نہیں ہو سکی اور یہ واقعہ ہے کہ جب ہم نے اس کے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو اس کی سطح نظر نہیں پڑتی تھی۔ پانی اس قدر نیلے رنگ کا تھا کہ سمندر کا پانی بھی اس قدر نیلا دیکھنے میں نہیں آیا، مگر نہایت شفاف تھا۔ تالاب کے دونوں جانب دو پتھر جو اس چٹان کے حصے تھے دور تک نیچے جاتے دکھائی دیتے تھے مگر تلے نظر نہ آتے تھے۔ اس تالاب کے عین اوپر پہاڑ سے چھت بنی ہوئی تھی جس میں ایک کافی بڑا سوراخ تھا اور اس سوراخ سے روشنی اندر آکر تمام

جگہ کو روشن کر رہی تھی۔ اس مقام کے ساتھ ہندوؤں نے یہ قصہ منسوب کر رکھا ہے کہ جو پہلا طوفان آیا وہ یہاں سے شروع ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس مقام کو بھیم کھنڈ کیوں کہا جاتا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا البتہ قیاس یہ کہتا ہے بھیم جو بادشاہ تھا اس کے ساتھ کوئی مناسبت ہوگی۔ کھنڈ سنسکرت میں تالاب کو کہتے ہیں اسی لئے بندھیل کھنڈ کے علاقے کا نام یہ پڑ گیا ہے کیونکہ اس علاقے میں جگہ جگہ تالاب اور جھیلیں ہیں۔

درحقیقت مستشرقین نے علاقہ طوفانِ نوح کے متعلق جو علاقہ تجویز کیا ہے وہ ارارات (Ararat) کا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات آشوریوں کی ہو رہی تھی۔

لفظ آشور کے متعلق ہم پچھلے کسی مقالہ میں لکھ آئے ہیں کہ یہ آشوریوں کا دیوتا تھا اسی کے نام پر مقام آشور (قلعہ شرکت) کا نام رکھا گیا اور اسی نام سے آشوری قوم کو (Assyrians.) یاد کیا جاتا ہے اس لفظ کا استعمال ہمیں خطِ میخی کے کتبوں میں دو طرح سے ملتا ہے ایک آشیر (.Ashir) اور دوسرے آشور (Ashur) ابتدا میں اس لفظ کو تین معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اول شہر یا بستی کے لئے۔ دوم ملک یا زمین کے لئے اور سوئم دیوتا کے معنوں میں۔ ہمیں آشیر (Ashir) کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابتدا میں لفظ رحمٰن اور رحیم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ سومیری (.Sumerian) زبان میں اسی لفظ کو آ۔ اُسار (.A-Usar) کہا جاتا تھا اب یہ معلوم نہیں کہ یہ لفظ سامی Sematic زبان کا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ عبرانی (.Hebrew) زبان کے لفظ آشر کا مترادف ہو۔ آشوری زبان میں اس لفظ کو دو طرح لکھا جاتا تھا خطِ میخی میں یہ لفظ ملاحظہ ہو۔

۱-

۲- 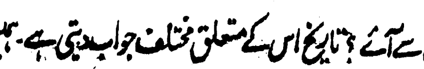

یہ آشوری کہاں سے آئے؟ تاریخ اس کے متعلق مختلف جواب دیتی ہے۔ ہمیں ان سب سے

اختلاف ہے۔ گذشتہ سال کے مقالوں میں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ بھی آرین اقوام کا ایک گروہ تھا جو سومیری اقوام کے بعد اس علاقے میں پہنچا۔ اگرچہ سومیری خود اس علاقے میں سے ہو کر ہلال خصیب کے جنوب میں پہنچے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقہ کی تہذیب اُر (Ur) کی تہذیب سے قدیم تر ہو۔ اور یہ جو آثار ثابت کرتے ہیں کہ یہاں کی تہذیب قدیم تر ہے تو غالباً اس اولین گروہ کے نشانات ہیں جو یہاں سے ہو کر گذریں اور سومیری کہلائیں۔ غالباً یہ گروہ آرمینیا (Armenia.) سے ہوتا ہوا کردستان پہنچا اور کردستان کو عبور کر کے ترکستان جس کو اس زمانے میں اناطولیا کہا جاتا تھا وہاں پہنچا اور پھر وہاں سے مملکتِ آشور آباد کی

مورخین یہ کہتے ہیں کہ آشوری حکومتِ بابل کے فرمانروا تھے اور اکادی تھے۔ ہمارے نزدیک یہ تشخیص غلط ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک زمانے میں آشور پر بابلیوں کی حکومت ہو گئی تھی جسے حمیرابو (Hammirab) نے اس کو فتح کر لیا تھا اس بات کو ثابت کرنے کے لئے انجیل سے سند لیجاتی ہے

مورخین کہتے ہیں کہ باب پیدائش (۱۱:۱) میں مذکور ہے کہ "آشور (نمرود) بابل سے باہر چلا گیا۔ اور نینوا کی بنیاد رکھی۔ ہماری دانست میں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آشور ہمیشہ ہی بابلیوں کے ماتحت رہا ہے، ان کی اپنی بھی حکومت تھی جو کئی صدیوں تک قائم رہی۔ بلکہ ہمیں تو بابلیوں کی تہذیب کا بھی آشوری تہذیب پر بہت کم اثر نظر آتا ہے۔ آکادی اور سومیری زبانوں کا بھی آشوری زبان سے دور کا تعلق نہیں۔ یہ دونوں زبانیں آشوری زبان سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ رسم الخط بہت ملتا ہے ممکن ہے یہ رسم الخط آشوری ہی میں شروع ہوا ہو۔ جیسے کتبوں سے ثابت ہے کہ آشوریوں کی تہذیب سومیری تہذیب سے زیادہ پرانی تھی۔ دو ہزار سال قبل مسیح آشوری تہذیب یہانتک ترقی کر چکی کہ ہمیں یہاں سیاسی اور ادبی ادارے ملتے ہیں۔ اور ان کے اپنے قانون ملک میں رائج تھے جن میں عورتوں کے حقوق کا باقاعدہ طور پر تحفظ کیا گیا تھا۔ ان کے وزرا اور امرا بھی سومیریوں سے زیادہ مہذب تھے جو اپنے محل اور لائبریریاں رکھتے تھے۔ یہ لائبریریاں اب متعدد جگہوں سے برآمد ہو چکی ہیں۔

مورخین کی ایک شاخ نے جب یہ محسوس کیا کہ آشوریوں کا تعلق اکادیوں اور سومیریوں کے ساتھ ثابت نہیں ہو سکتا تو انھوں نے یہ کوشش شروع کی کہ ان کو سمیٹک (Semetic.)